جوں ہی کانوں میں آواز آتی "ست گردت شودت داتا" لوگ سمجھ جاتے کہ سویرا ہو گیا۔ اس کی یہی حرکت اس کے تکمیل اعضاء کا ثبوت تھی۔ ورنہ طلوع سحر کے بعد پھر اسے ایک متحرک بسٹ خیال کرنے میں اگر کوئی امر مانع تھا تو یہ وہی ست گردت کا کلمۂ وحدت تھا۔ جس سے وہ اپنے طوطے کو عبادت کی تلقین کیا کرتا تھا۔ فی الواقع مہادیو بے کار ہستی کا ایک نادر مجسمہ تھا۔ جو شکستوں اور ناکامیوں سے بیخبر۔ زخموں اور چرکوں سے بے پروا۔ ابھی تک شمشیر بکف میدان میں مردانہ وار کھڑا تھا جو اس کا بلیرہ متشعر دانتوں کا دستہ پامال کمر کا میمنہ متزلزل۔ خونِ قلب پریشان ہو چکا تھا۔ مگر ہمت وہی تھی، استقلال وہی۔ جس پر شباب کو رشک ہو سکتا تھا۔

مہادیو خوش نصیب بھی تھا اور کم نصیب بھی۔ خوش نصیب اس لیے کہ اس کے تین لڑکے تھے۔ تین بہوئیں تھیں اور بہوؤں کے لڑکے تھے۔ لڑکے کہتے اجی جب تک دادا جیتے ہیں تب تک تو زندگی کا لطف اٹھا لیں۔ پھر تو یہ ڈھول گلے پڑے ہی گی۔ ممکن تھا کہ لڑکے اپنے باپ کی کچھ مدد کرتے۔ لیکن چونکہ مہادیو اپنے بزرگانہ اختیارات سے مستعفی نہ ہوتا تھا۔ اس لیے لڑکے اس کی ذمہ داریوں میں مخل ہونے کی ضرورت بھی نہ سمجھتے تھے اور اس لازم و ملزوم کی چکی میں پڑا ہوا وہ نیم جان خستہ حال بڈھا پسا جاتا تھا۔ اس پر لطف یہ کہ

انقضاءِ عمر کے ساتھ ان ذمہ داریوں کی نسبت معکوس تھی۔ دائرۂ کفالت روز بروز وسیع اور وسائل معاش روز بروز تنگ ہوتے جاتے۔ پہلے کوزہ کا ذوق مہادیو کی ذات تک محدود تھا۔ پر اب سعادتمند بیٹے بھی باپ کے نقشِ قدم پر چلنے لگے تھے۔ مہادیو کو ساقی اور بسا اوقات ساقی ناکام کا پارٹ ادا کرنا پڑتا تھا۔ بیٹے اس وقت بجذباتِ حریت اور مساوات کے ایسے پُرشور مناظرے کرتے کہ کبھی کبھی یہ جوش فرزندانہ سعادت مندی پر بھی غالب آجاتا تھا اور اس وقت تک فرو نہ ہوتا تھا۔ جب تک کہ ماکولات کی مساوی مقدار ان کی تسکینِ قلب کے لیے نہ پہنچ جاتی۔ بیچارہ مہادیو کبھی کبھی اس شورِ قیامت سے تنگ آکر بھوکا اُٹھ آتا اور اپنے غمگسار حقے کا نغمۂ شیریں سُنتا سُنتا سو جاتا۔ افسوس یہی ہے کہ باہر بھی اُسے ان باغیانہ مناظروں سے نجات نہ تھی۔ باوجودیکہ وہ اپنے فن میں یگانۂ روزگار تھا۔ ان کی گھٹا اوروں سے کہیں زیادہ دیرا ثر تھی۔ اس کی صفائی کہیں زیادہ وقت طلب اور اُس کے کیمیائی عمل کہیں زیادہ قوی التاثیر۔ تاہم اُسے بے صبر اور وہمی اشخاص کی بدزبانیوں کا آئے دن نشانہ بننا پڑتا تھا۔ پر مہادیو عابدانہ توکل کے ساتھ سر جھکائے ہوئے چاروں طرف کی بوچھاڑیں سہا کرتا۔ اس کے کان روزانہ نفرین اور دُشنام طعن و تشنیع کے اس قدر عادی ہو گئے تھے کہ اسے اب ان کا احساس ہی نہ ہوتا تھا۔ جوں ہی یہ طوفان فرو ہوتا۔ وہ اپنے

طوطے کی طرف دیکھ کر پکار اٹھتا "ست گرُدت شیودت داتا"۔
اس اسم اعظم کا ورد اس کی تشفی کامل کا وسیلہ بن جاتا تھا۔ یہ جھونکے
اس کی زندگی کے ایک جزو لازم بن گئے تھے۔ ان سے اس کے سکون
میں مطلق فرق نہ پڑتا تھا۔

(۲)

ایک روز اتفاق سے کسی لڑکے نے پنجرے کا دروازہ کھول
دیا۔ طوطا اُڑ گیا۔ مہادیو نے سر اٹھا کر پنجرے کی طرف دیکھا اور
اس کا کلیجہ سن سے ہو گیا۔ ایں! طوطا کہاں گیا! اُس نے پھر پنجرے
کی طرف دیکھا۔ طوطا غائب تھا۔ وہ گھبرا کر اٹھا اور ادھر اُدھر کھپریلوں
پر نظر دوڑانے لگا۔ اُسے دنیا میں اگر کوئی چیز پیاری تھی تو یہ طوطا تھا۔
لڑکے بالوں۔ ناتی پوتوں سے اس کی طبیعت آسودہ ہو گئی تھی۔
وہ کبھی کسی بچّہ کو گود میں نہ لیتا۔ بچّوں کی شرارت سے اس کے کام
میں ہرج ہوتا تھا۔ کوئی ہتھوڑا چھین لیتا۔ کوئی سنسی اُٹھا لیتا۔
اس لیے وہ اپنے قریب بھی نہ آنے دیتا تھا۔ بیٹوں سے اُسے مطلق اُنس
نہ تھا۔ نہ اس لیے کہ وہ کاہل وجود تھے بلکہ اس لیے کہ وہ اس کے شریک
کوزہ ہو جاتے تھے۔ محلّہ کے آدمیوں سے اُسے چڑ تھی۔ اس لیے کہ وہ
اس کی بھٹی سے آگ نکال لے جاتے تھے۔ اس تمام مجمع شر سے اس
کے لیے کوئی پناہ تھی تو وہ یہی طوطا تھا جس کی ذات سے اسے کوئی
تکلیف، کوئی الجھن کوئی پریشانی نہ ہوتی تھی۔ وہ اب زندگی کی اس

منزل پر پہنچ گیا تھا۔ جب انسان کی نگاہوں میں عافیت کی۔ گوشۂ امن کی وقعت دنیا کی اور سب چیزوں سے زیادہ ہو جاتی ہے۔

طوطا ایک کھپریل پر بیٹھا تھا۔ مہادیو نے پنجرا اُتار لیا اور اُسے دکھا کر کہنے لگا۔ "آ۔ آ۔ ست گرُدت۔ شیلودت داتا۔ آ۔ آ" لیکن گاؤں اور گھر کے کئی لڑکے جمع ہو کر چلّانے اور تالیاں بجانے لگے۔ اوپر سے کوّوں نے کائیں کائیں شروع کی۔ طوطا اُڑا۔ اور گاؤں سے باہر نکل کر ایک درخت پر جا بیٹھا۔ مہادیو بھی خالی پنجرا لیے اس کی طرف دوڑا۔ ہاں دوڑا! لوگ اس کی تیز گامی پر عش عش کرتے تھے ہوس کی اس سے بہتر اس سے جامع اس سے زندہ تصویر شاید کسی مصور کے خیال میں نہیں آسکتی۔ پُشتِ دوتا اور سرعت گام میں کوئی نفاق نہیں ہے۔ اس کی تصدیق ہو گئی۔

دوپہر ہو گئی تھی۔ کسان پُر چھوڑ چھوڑ کر چلے آتے تھے۔ اس موقعہ تفریح کو کیوں ہاتھ سے جانے دیتے۔ مہادیو کی دل آزاری میں ہر شخص کو مزہ آتا تھا۔ بالخصوص اس کی تگاپوئے پُرخم کا نظارہ نہایت فرحت انگیز تھا۔ لوگوں نے کنکر پھینکے۔ تالیاں بجائیں۔ طوطا پھر اُڑا اور اس درخت سے دور۔ آم کے گھنے باغ میں ایک درخت کی چوٹی پر جا بیٹھا مہادیو پھر خالی پنجرا لیے آ۔ آ کرتا طوطے کی طرف ٹکٹکی لگائے مینڈک کی طرح اُچکتا ہوا چلا۔ کسانوں کا غول بھی ہو ہو مچاتا ہوا اس کے پیچھے دوڑا۔ مگر اس کی سرگرمی طلب ان کے شوقِ تفریح پر غالب آئی۔ جب

وہ اس گھنے باغ میں پہنچا تو اکیلا تھا۔ اُس نے سایہ میں ذرا دم لیا۔ پَیر کے تلووں سے آگ نکل رہی تھی۔ جب ہوش بجا ہوئے تو اس نے پھر پنجرا اُٹھایا اور پھر کہنے لگا "ست گرُو دت شیو دت داتا۔ آ۔ آ!"

طوطا پھنگی سے اتر کر نیچے کی ایک شاخ پر آ بیٹھا۔ مگر مہادیو کی طرف مشتبہ نگاہوں سے دیکھ کر پھر اُڑا اور دوسری شاخ پر جا بیٹھا مہادیو نے سمجھا مجھ سے ڈر رہا ہے۔ وہ پنجرے کو چھوڑ کر آپ ایک دوسرے درخت کی آڑ میں چھُپ گیا۔ طوطے نے چاروں طرف غور سے دیکھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اب کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ اُترا اور آکر پنجرے کے اوپر بیٹھ گیا۔ مہادیو کا کلیجہ اُچھلنے لگا۔ ست گرُو دت شیو دت کا ورد کرتا ہوا آہستہ آہستہ طوطے کے قریب آیا اور تب ایک جست مار کر لپکا کہ طوطے کو پکڑ لے مگر طوطا ہاتھ نہ آیا۔ پھر اُڑ کر درخت پر جا پہنچا۔

شام تک یہی کیفیت رہی۔ طوطا کبھی اس شاخ پر جاتا۔ کبھی اُس شاخ پر۔ کبھی پنجرے پر آتا۔ کبھی پنجرے کے دروازے پر بیٹھ کر اپنے دانہ پانی کی پیالیوں کو دیکھتا مگر جونہی مہادیو اس کی طرف آتا۔ وہ پھر اُڑ جاتا۔ بڈھا اگر پیکرِ ہوس تھا تو طوطا طائرِ آرزو۔ یہاں تک کہ شام سیاہ نے ہوس اور آرزو کی اس کشمکش پر پردہ ڈال دیا۔

(۳)

رات ہو گئی۔ چاروں طرف اندھیرا چھا گیا۔ طوطا معلوم نہیں

پتوں میں کہاں چھپا بیٹھا تھا۔ مہادیو خوب جانتا تھا۔ کہ رات کو کہیں طوطا اُڑ کر نہیں جا سکتا اور نہ پنجرے میں آسکتا ہے۔ تاہم وہ اس درخت کے نیچے سر جھکائے پنجرے کو پہلو میں رکھے بیٹھا ہوا تھا۔ آج اس نے دن بھر کچھ نہیں کھایا۔ رات کے کھانے کا وقت بھی نکل گیا۔ ایک بُوند پانی بھی اس کے حلق میں نہیں گئی۔ لیکن اُسے نہ بھوک تھی نہ پیاس۔ طوطے کے بغیر اسے اپنی زندگی ویران۔ خشک دُشوار معلوم ہوتی تھی۔ وہ شب و روز مشقت کرتا تھا۔ اس لیے کہ یہ اس کی تحریک طبعی تھی۔ زندگی کے اور سب کام اس لیے کرتا تھا کہ اس کی عادت تھی۔ ان کاموں میں اُسے حیات کا مطلق احساس نہ ہوتا تھا۔ طوطا ہی ایک ایسی چیز تھا۔ جو اُسے اس کی حیات کی یاد دلاتا تھا۔ عملاً وہ ایک مُردہ وجود تھا۔ کوئی شوق نہیں۔ کوئی آرزو نہیں۔ کوئی فکر نہیں۔ کوئی ہوس نہیں۔ اس حیاتِ مطلق میں یہی طائرِ خوش رنگ و خوش نوا اُسے علائقِ زیست کی خبر دیتا تھا۔ اس تاریکی میں یہی ایک روشنی تھی۔ اس سناٹے میں یہی ایک صدا۔ اس کا ہاتھ سے جانا اپنے وجود سے بیخبر ہونا تھا۔

مہادیو دن بھر کا بھوکا پیاسا تھکا ماندہ رہ رہ کر جھپکیاں لے لیتا تھا مگر ذرا ہی دیر میں وہ چونک کر پھر آنکھیں کھول دیتا اور اس فضائے تاریک میں اس کی آواز سنائی دیتی "ست گردت۔ شیوت داتا!"

آدھی رات گزر گئی تھی۔ یکبارگی وہ کوئی آہٹ پاکر چونکا۔ تو دیکھا۔

کہ ایک دوسرے درخت کے نیچے ایک دھندلا سا چراغ جل رہا ہے اور کئی آدمی بیٹھے ہوئے آپس میں آہستہ آہستہ کچھ باتیں کر رہے ہیں۔ وہ سب شاید چلم پی رہے تھے۔ تمباکو کی مہک نے مہادیو کو بیتاب کر دیا۔ بلند آواز سے بولا۔ "ست گردت شیو دت داتا" اور ان آدمیوں کی طرف چلا۔ مگر جس طرح بندوق کی آواز سنتے ہی ہرن بھاگ جاتے ہیں۔ اسی طرح وہ سب کے سب، اٹھ کر بھاگ گئے۔ کوئی ادھر گیا۔ کوئی اُدھر۔ مہادیو نے زور زور سے پکارنا شروع کیا۔ ٹھہرو! ٹھہرو! دفعتہً اسے خیال آگیا کہ یہ سب چور ہیں۔ وہ زور سے چلّانے لگا "چور! چور! پکڑو۔ پکڑو!" چوروں نے پیچھے پھر کر بھی نہ دیکھا۔

مہادیو چراغ کے پاس گیا تو اسے ایک کلسا رکھا ہوا ملا۔ وہ زنگ سے سیاہ ہو رہا تھا۔ مہادیو کا سینہ اچھلنے لگا۔ اس نے کلسے میں ہاتھ ڈالا تو اشرفیاں تھیں۔ اس نے ایک اشرفی باہر نکالی اور چراغ کے اجالے میں غور سے دیکھا۔ ہاں اشرفی تھی۔ اس نے کلسا اٹھا لیا۔ چراغ بجھا دیا اور درخت کے نیچے چھپ کر بیٹھ رہا مالِ حرام نے شاہ سے چور بنا دیا۔

اسے پھر اندیشہ ہو کہ ایسا نہ ہو چور واپس آجائیں اور مجھے تنہا دیکھ کر کلسا چھین لیں۔ اس نے کچھ کچھ اشرفیاں نکال کر کمر میں باندھیں۔ پھر ایک سوکھی لکڑی سے زمین کی مٹی ہٹا کر کئی جگہ گڑھے بنائے۔

اور انہیں اشرفیوں سے بھر کر مٹی سے ڈھانک دیا اور حالانکہ ابھی زیادہ تعداد کلسے ہی میں تھی لیکن اس کی کمر اور گڑھوں میں دو سو سے کم نہ تھیں۔

(۴)

مہادیو کی نظروں کے سامنے اب ایک دوسری دنیا تھی۔ نامی روشن۔ ذی حیات۔ فکریں۔ تمنائیں اور ارادے اُگے۔ بڑھے اور لہرانے لگے۔ افلاس کی سیاہ گھٹا ہٹتے ہی بزم انجم آراستہ نظر آتی۔ حالانکہ ابھی خزانے کے ہاتھ سے نکل جانے کا اندیشہ باقی تھا۔ پر نامیہ کو مقراض گلچیں کی کیا پروا؟ ایک پختہ مکان بن گیا صرافہ کی ایک شاندار دکان کھل گئی۔ عزیز و بیگانہ گلوگیر ہو گئے۔ بادہ گلگوں کے دور چلنے لگے۔ عیش و تکلف کے سامان فراہم ہو گئے۔ پھر تیرتھ جاترا کو چلے اور واپسی پر فیاضانہ دعوتِ عام ہونے لگی۔ اس کے بعد ایک شوالہ اور پختہ کنواں تعمیر ہو گیا اور وہ روز شام کو بیٹھ کر وہاں کتھا پران سننے لگا۔ سادھو سنتوں کی محفل سج گئی۔ دورۂ زندگی کا نقشہ مکمل ہو گیا۔ "آئندہ" کا ساز نغمہ ریز ہو گیا۔

دفعتہً اُسے خیال آیا کہ کہیں چور آ جائیں تو میں کلسا لے کر بھاگوں گا کیونکر؟ اس نے امتحاناً کلسے کو بغل میں دبا لیا اور ایک سو قدم تک بے تحاشا دوڑا ہوا چلا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اس کے پیروں میں پر لگ گئے ہیں۔ اطمینان ہو گیا۔

انہیں منصوبوں میں رات ختم ہو گئی۔ سفیدۂ صبح نمودار ہو گیا۔ ہوا جاگی۔ سوئے ہوئے درخت بیدار ہوئے۔ چڑیاں گانے لگیں۔ ناگاہ مہادیو کے کانوں میں آواز آئی :-

ست گردت شیودت داتا

رام کے چرن میں چت لاگا

یہ بول ہمیشہ مہادیو کے ورد زبان رہتا تھا۔ دن میں ہزاروں بار یہ الفاظ اس کی زبان سے نکلتے تھے۔ پران کی باطنی کیفیت نے اس کے دل پر کبھی اثر نہ کیا تھا۔ جیسے کسی باجے سے آواز نکلتی ہے۔ اسی طرح یہ بول اس کی زبان سے نکلتا تھا۔ بے معنی اور بے اثر اس کا دل بے برگ و بار اس ہوائے لطیف سے بے حس رہتا تھا لیکن اب اس میں پتیاں اور کونپلیں نکل آئی تھیں۔ اس ہوا سے جھوم اُٹھا۔ محوِ ترنم ہو گیا۔

ایک طرف طلوعِ سحر کی معرفت خیز تنویر تھی۔ دوسری طرف دریا کا روحانی نغمہ اور سطحِ آب کا عارفانہ سکون۔ فضائے محیط ایک نورانی راگ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ عین اسی وقت طوطا شاخِ بلند سے پروں کو جوڑے ہوئے اُترا۔ جیسے آسمان سے کوئی تارا ٹوٹے اور آکر پنجرے میں بیٹھ گیا۔ مہادیو فرطِ مسرت سے دوڑا اور پنجرے کو اٹھا کر بولا۔ "آؤ آتما رام! اب تمہیں چاندی کے پنجرے میں رکھوں گا اور سونے سے مڑھ دوں گا۔" احسان اور تشکر سے اس کا

سینہ لبریز ہو گیا۔ پرماتما کتنا دیا دان ہے، کتنا بے کس نواز۔ یہ اُس کی عین رحمت ہے۔ ورنہ مجھ جیسا عاصی۔ سرتاپا گناہوں میں ڈوبا ہوا کب اس عطائے بیکراں کے قابل تھا؟ ہاں یہ اس کا فضل و کرم ہے۔ ان خیالات سے اس کا دل اُمڈ آیا۔ اس پر ایک سرور کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ ایک خود مستی کے عالم میں بول اٹھا:۔

ست گرو دت شودت دانا
رام کے چرن میں چت لاگا

اس نے ایک ہاتھ میں پنجرا لٹکایا۔ بغل میں کلسا دبایا گھر چلا

(۵)

مہادیو اپنے مکان پر پہنچا تو ابھی کچھ اندھیرا تھا۔ گھر کے لوگ خوابِ سحر کا لطف اٹھا رہے تھے۔ راستے میں بجز ایک کتے کے اور کسی سے اس کی مڈبھیڑ نہ ہوئی اور کتے کو اشرفیوں سے کوئی خاص رغبت نہیں ہوتی۔ گھر پہنچتے ہی اس نے کلسے کو ایک مٹی کی ناند میں چھپا دیا اور اسے کوئلہ سے اچھی طرح ڈھانک کر اس کو ٹھڑی میں رکھ دیا۔ جس میں اس کے اوزار اور نیم مرتب زیورات رکھے جاتے تھے جب ذرا دن نکل آیا تو وہ سیدھا پروہت جی کے مکان پر جا پہنچا پروہت جی پوجا پر بیٹھے ہوئے سوچ رہے تھے۔ کل ہی مقدمہ کی پیشی ہے اور ابھی تک روپیہ کی کوئی سبیل نہ کر سکا۔ کیونکر کام

چلے گا۔ ججمانوں میں کوئی سانس ہی نہیں لیتا کہ اتنے میں مہادیو نے پہنچ کر پالاگن کیا۔ پروہت جی نے اسے دیکھ کر منہ پھیر لیا۔ یہ اپنی منحوس صورت لے کر یہاں کیونکر آ کھڑا ہوا؟ معلوم نہیں آج دانہ بھی میسر ہوگا۔ یا نہیں۔ کچھ ترش ہو کر پوچھا "کیا ہے جی! کیا کہتے ہو! کیا جانتے نہیں کہ ہم اس مکبوت پوجا پر رہتے ہیں؟" مہادیو نے کہا۔ "مہاراج آج میرے یہاں ستیہ نارائن کی کتھا ہے۔"

پروہت جی متحیر ہو گئے۔ انہیں اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ مہادیو کے گھر کتھا کا ہونا اتنی ہی غیر معمولی بات تھی۔ جتنی اپنے گھر سے کسی بھکاری کے لیے بھیک کا نکلنا۔ پوچھا۔ "آج کیا ہے؟"

مہادیو بولا "کچھ نہیں۔ ایسا ہی جی میں آیا۔ کہ آج بھگوان کی کتھا سن لوں۔"

صبح ہی سے تیاریاں ہونے لگیں۔ بلند و ادر قریب و جوار کے دوسرے موضعوں میں نوید پھری۔ ہر کس و ناکس خاص و عام کی دعوت تھی۔ جو سنتا تھا۔ تعجب کرتا تھا لیکن تیاریاں اتنے وسیع پیمانہ پر ہو رہی تھیں کہ کسی کو شک و شبہ کی مطلق گنجائش نہ تھی۔ شام کو جب سب لوگ جمع ہو گئے اور پنڈت جی آ کر سنگھاسن پر رونق افروز ہوئے تو مہادیو کھڑا ہو کر بلند آواز سے بولا "بھائیو! میری ساری عمر چھل کپٹ میں بیت گئی۔ میں نے نہ جانے کتنے آدمیوں کو دغا دی۔ کتنا کھرے کو کھوٹا کیا۔ یہاں تک کہ آپ لوگ صبح کو میرا منہ دیکھتے ہوئے

ڈرتے تھے۔ پر اب بھگوان نے مجھ پر دیا کی ہے۔ وہ میرے منہ کے کالک کو دور کرنا چاہتے ہیں۔ میں آپ سب بھائیوں سے للکار کر کہتا ہوں کہ جس کا میرے جمے کچھ نکلتا ہو۔ جس کی جمع میں نے مار لی ہو جس کے گہنے دبا لیے ہوں۔ جس کے چوکھے مال کو کھوٹا کر دیا ہو۔ وہ اپنے ایمان دھرم سے آکر مجھ سے اپنی ایک ایک کوڑی پچکا لیے اگر کوئی یہاں نہ آسکا ہو تو آپ لوگ اس سے کہہ دیجئے کہ وہ کل سے ایک مہینے تک جب جی چاہے آدے اور اپنا حساب چکتا کر لے۔ کوئی گواہی ساکھی درکار نہیں۔ بس لوگ اپنے ایمان دھرم سے جو کچھ کہہ دیں گے وہ میں نکال کر دے دوں گا۔"

اس تقریر نے مجمع پر سکوت کی کیفیت طاری کر دی۔ سرگوشیاں ہونے لگیں۔ کوئی پُر معنی انداز سے سر ہلا کر کہتا تھا "ہم کہتے نہ تھے؟" کوئی حاسدانہ انداز سے کہتا تھا "کوئی دفینہ ہاتھ آگیا۔" کوئی بدگمانی سے کہتا تھا "کیا کھا کے دے گا۔ ہزاروں کا ٹوٹل ہو جائے گا۔"

ایک زندہ دل ٹھاکر نے مسکرا کر مہادیو سے پوچھا "اور جو لوگ مر گئے؟"

مہادیو نے جواب دیا "ان کے گھر والے تو ہونگے وہ آکر ایمان دھرم سے جو کچھ نکلتا ہو لے لیں۔"

مگر اس وقت کسی کو وصولی کی اتنی فکر نہ تھی جتنی یہ جاننے کی کہ اسے اتنے روپے مل کہاں سے گئے۔ کچھ دیر تک یہی عالم سکوت

رہا۔ لوگ ایک دوسرے کا منہ تاکتے تھے۔ ہر کسی کو مہادیو کے پاس آنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔ دیہات کے آدمی تھے جس نقصان کو ایک بار پھر صبر کر چکے اس کی یاد تازہ کرنا ان کا خاصہ نہ تھا۔ پھر اکثر آدمیوں کو یاد بھی نہ تھا کہ ان کا کتنا نقصان ہوا اور ایسے مقدس موقع پر غلط بیانی کا خوف ان کی زبان بند کیے ہوئے تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ مہادیو کی صوہمتی اور نیک نیتی نے انہیں مرعوب کر لیا تھا۔ بحر سکوت میں ایک موج بھی نہ اٹھی۔ دفعتہً پروہت جی بولے "تمہیں یاد ہے کہ میں نے تمہیں ایک کنٹھا بنانے کے لیے سونا دیا تھا اور تم نے کئی ماشے تول میں اڑا دیئے تھے۔ سونا بھی خراب کر دیا تھا؟"

مہادیو۔ ہاں یاد ہے آپ کا کتنا نقصان ہوا ہوگا؟

پروہت جی۔ پچاس روپیہ سے کم نہ ہوگا۔

مہادیو نے کمر سے دو اشرفیاں نکالیں اور جا کر پروہت جی کے سامنے رکھ دیں۔

پنڈت جی کی سخت گیری پر پھر سرگوشیاں ہونے لگیں۔ یہ ظلم ہے۔ زیادتی ہے۔ زیادہ سے زیادہ دو چار روپے کا نقصان ہوا ہوگا اس کے پچاس روپیہ اینٹھ لیے۔ کچھ نارائن کا بھی ڈر نہیں ہے۔ بننے کو پنڈت پر نیت ایسی خراب! رام رام!!

ہر ایک دل میں مہادیو سے وہ ہمدردی پیدا ہو گئی جو عقیدت

سے مشابہ ہوتی ہے۔ اشرفیوں کی خوش آئند آواز نے بعض کمزور دلوں کو گدگدایا ضرور۔ پر عام ہمدردی اور خوف پشیمانی نے اس گدگدی کو سینہ ہی میں دبا دیا۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ پر ہزاروں نفوس کے مجمع میں ایک شخص بھی نہ کھڑا ہوا۔ تب مہادیو نے پھر کھڑے ہو کر کہا "معلوم ہوتا ہے آپ لوگ اپنا اپنا حساب بھول گئے ہیں۔ اس لیے آج کتھا ہونے دیجئے میں ایک مہینہ تک آپ لوگوں کی راہ دیکھوں گا۔ اس کے بعد تیرتھ کرنے چلا جاؤں گا۔ آپ سب بھائیوں سے بنتی ہے کہ میرا ادھار کریں۔"

مہادیو کے چہرے پر ایک غیر معمولی جلال تھا اور اندازِ گفتگو میں ایک شانِ توقیر۔ کتھا شروع ہوئی اور ختم ہو گئی۔ مہادیو کی داد و دہش اور فیاضانہ سرگرمی نے لوگوں کی عقیدت کو احترام کی حد تک پہنچا دیا۔

مہادیو صبح سے شام تک اہلِ تقاضا کی راہ دیکھا کرتا۔ رات کو چوروں کے خوف سے نیند نہ آتی۔ اب وہ کام نہ کرتا۔ شراب کا چسکا بھی چھوٹا۔ ہاں سادھو فقیر جو دروازہ پر آجاتے۔ ان کی خاطر خواہ تواضع و تکریم کرتا۔ قرب و جوار میں اس کے بذل و ایثار کا شہرہ ہو گیا۔ یہاں تک کہ پورا ایک مہینہ گزر گیا اور ایک دادخواہ بھی نظر نہ آیا۔ اب مہادیو کو اندازہ ہو گیا کہ دنیا میں کتنا تحمل کتنی

پاک ہمتی ہے۔ اب اُسے معلوم ہوا کہ دنیا بزدلوں کے لیے بُری ہے۔ پر اچھوں کے لیے اچھی ہے۔

(۶)

اس واقعہ کو گزرے پچاس سال سے زائد ہو گئے۔ بلیندو میں آپ جائیے تو دور ہی سے ایک رفیع اور طلائی کنگرہ نظر آتا ہے۔ یہ ٹھاکر دوارہ کا کلس ہے۔ اس کے متصل ایک وسیع اور پختہ تالاب ہے۔ جس میں ہمیشہ کنول کھلے رہتے ہیں۔ اس کی مچھلیاں کوئی نہیں پکڑتا۔ تالاب کے کنارے ایک عالی شان مقبرہ ہے۔ یہی آتمارام کی یادگار ہے۔ اس جگہ وہ اپنے نقرئی پنجرے میں بیٹھے ہوئے محو خواب ہیں۔ اس کی نسبت مختلف روایتیں مشہور ہیں۔ کوئی کہتا ہے۔ وہ بیٹھے بیٹھے نظروں سے غائب ہو گئے۔ پر حقیقت یہ ہے کہ مہادیو تیرتھ سے واپس آیا تو ایک دن کسی گربۂ مسکین نے آتمارام کو لقمۂ دہن بنا لیا۔ لوگ کہتے ہیں کہ اب بھی آدھی رات کو تالاب کے کنارے آواز آتی ہے:-

ست گرُ دت شیو دت داتا

رام کے چرن میں چت لاگا

مہادیو کی نسبت بھی طرح طرح کے قصّے مشہور ہیں جن میں سب سے قرین قیاس یہ ہیں کہ وہ آتمارام کے قفس عنصری سے پرواز کرنے کے بعد چند سنیاسیوں کے ساتھ ہمالہ کی طرف چلے گئے۔ اور وہاں

سے واپس نہ آئے۔ ان کا نام آتمارام مشہور ہو گیا۔

ابھی گاؤں میں وہ بڈھے موجود ہیں جنہوں نے مہادیو کو آخری ایام میں دیکھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کا چہرہ پر جلال تھا اور ان کی زبان سے جو کچھ نکلتا۔ وہ ضرور پورا ہوتا تھا۔ ان کے کشف و کرامات کی صدہا داستانیں زبان زدِ خاص و عام ہیں۔

خدا کے کتنے گنہگار بندے محض ایک صدائے غیب کی بدولت محض ایک اتفاقی وجد کے اثر سے محض ایک الہامی تحریک سے درجہ کمال کو پہنچ گئے۔

بینک کا دیوالہ

لکھنؤ انڈسٹریل بینک کے وسیع دفتر میں لالہ سائیں داس آرام کرسی پر لیٹے ہوئے انوسٹرس ریویو کا مطالعہ کر رہے تھے۔ اور سوچ رہے تھے۔ کہ اب کے معاملہ داروں کو منافع کہاں سے دیا جائے گا؟ چائے کو ملہ یا جوٹ کے حصے خریدنے یا چاندی سونے اور روئی کا سٹہ کرنے کا ارادہ کرتے۔ مگر نقصان کا اندیشہ کوئی فیصلہ قائم نہ ہونے دیتا تھا۔ غلہ کے کاروبار میں اب کے بڑا خسارہ رہا۔ حصہ داروں کی تشفی و اطمینان کے لیے فرضی حسابات تیار کرنا پڑے۔ اور منافع اصل روپیہ سے دینا پڑا۔ اس وجہ سے پھر غلہ کے کام میں ہاتھ ڈالتے ہوئے روح کانپتی تھی۔

مگر روپے کا بے کار رکھنا غیر ممکن تھا۔ دو ایک روز میں اس کے استعمال کی کوئی نہ کوئی صورت نکالنی لازمی تھی۔ کیونکہ ڈائریکٹروں کا سہ ماہی اجلاس ایک ہی ہفتہ

میں ہونے والا تھا۔ اور اگر اس وقت تک فیصلہ نہ ہو سکا۔ تو پھر آئندہ تین ماہ تک کچھ نہ ہو سکے گا۔ اور ششماہی تقسیم منافع کے موقع پر پھر وہی فرضی کاروائی کرنا پڑے گی جس کا متواتر متحمل ہونا بینک کے لیے دشوار تھا۔ بہت دیر تک اس خلجان میں پڑے رہنے کے بعد سائیں داس نے گھنٹی بجائی۔ اور بغل کے دوسرے کمرے سے ایک بنگالی بابو نے سر نکال کر جھانکا۔

سائیں داس۔ ٹاٹا اسٹیل کمپنی کو ایک خط لکھ دیجئے۔ کہ وہ اپنا حال کا بیلنس شیٹ بھیج دیں۔

بابو۔ ان لوگوں کو روپیہ کا گرج نہیں۔ چٹھی کا جواب نہیں دیتا۔

سائیں داس۔ اچھا ناگپور کے سودیشی مل کو لکھئے۔

بابو۔ اس کا کاروبار اچھا نہیں ہے۔ ابھی اس کے مجوروں نے ہڑتال کیا تھا وہ مہینہ تک مل بند رہا۔

سائیں داس۔ اجی تو کہیں لکھو بھی۔ تمہارے خیال میں تو ساری دنیا بے ایمانوں سے بھری ہوئی ہے۔

بابو۔ بابا لکھنے کو تو ہم سب جگہ لکھ دیں۔ مگر کھالی لکھ دینے سے کچھ فائدہ تو نہیں ہوتا۔

لالہ سائیں داس اپنے خاندانی رسوخ کے باعث بینک کے مینجنگ ڈائریکٹر ہو گئے تھے۔ مگر کاروباری دنیا سے بہت واقفیت نہ رکھتے تھے یہی بنگالی بابو اِن کے مشیرِ خاص تھے۔ ان بابو صاحب کو کسی کارخانہ یا کمپنی پر اعتماد نہ تھا۔ انہیں کی بزدلانہ احتیاط کے باعث پچھلے سال بینک کا روپیہ صندوق سے باہر نہ نکل

سکا تھا۔ اور اب وہی صورت درپیش تھی۔ سائیں داس کو اس مشکل سے عہدہ برآ ہونے کی کوئی تدبیر نہ سوجھتی تھی۔ اور نہ اتنی ہمت تھی کہ اپنی ذمہ داری پر کسی کاروبار میں بے خوف ہو کر کود پڑیں۔ پریشانی کے عالم میں اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے کہ دربان نے آکر خبر دی۔ کہ "برہل کی رانی صاحبہ کی سواری آئی ہے"۔

(۲)

لالہ سائیں داس چونک پڑے۔ برہل کی رانی صاحبہ کو لکھنؤ آئے تین چار دن ہوئے تھے۔ اور ہر ایک زبان پر انہیں کے چرچے تھے کوئی ان کی سادگی اور نفاست پر قربان تھا۔ کوئی ان کے حسن صورت پر، کوئی ان کی آزادروی پر، یہاں تک کہ ان کی کنیزیں، باڈی گارڈ، سپاہی وغیرہ بھی اس عام توجہ میں شریک تھے۔ رائل ہوٹل کے دروازے پر تماشائیوں کا ایک ہجوم سا لگا رہتا۔ کتنے ہی دیدہ ناز بے فکر لوگ، عطر فروش، بزاز، تمباکو گر، کارو پ بھر بھر کے ان کی خدمت میں باریاب ہو چکے تھے۔ جس طرف سے رانی صاحبہ کی سواری نکل جاتی تماشائیوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ کھڑے ہو جاتے تھے۔ واللہ کیا شان ہے۔ ایسی عراقی جوڑی لاٹ صاحب کے سوا اور کسی راجہ رئیس کے ہاں تو شاید ہی نکلے۔ اور کیا سجاوٹ ہے! سبحان اللہ ایسے گورے چٹے آدمی تو یہاں کبھی نظر نہیں آتے۔ یہاں تو روسا بیضۂ مرغ، کشتۂ شنگرف اور مارا لحم اور خدا جانے کیا کیا خاک بلا کھاتے رہتے ہیں۔ پر کسی کے چہرے پر سرخی یا تازگی کا نام نہیں۔ یہ لوگ نہ جانے کیا کھاتے ہیں۔ اور کس کنویں کا پانی پیتے ہیں۔ کہ جسے دیکھئے تازہ سیب بنا ہوا ہے۔ یہ سب آب و ہوا کی برکت ہے۔

برہل شمال کی طرف نیپال کے قریب انگریزی عملداری میں ایک ریاست تھی۔ اور اگرچہ اس کے محاصل کی نسبت عوام میں مبالغہ آمیز روائتیں مشہور تھیں۔ مگر فی الواقع اس ریاست کی آمدنی دو لاکھ سالانہ سے زائد نہ تھی۔ ہاں اس کا رقبہ بہت وسیع تھا۔ زمین زیادہ تر غیر آباد تھی۔ آباد حصہ بھی کوہستانی اور کم زراعت تھا۔ زمین بہت سستی اٹھتی تھی۔

لالہ سائیں داس نے فوراً الگنی سے اتار کر ریشمی سوٹ پہن لیا۔ اور میز پر آکر اس شان سے بیٹھ گئے۔ گویا راجہ رانیوں کا یہاں آنا غیر معمولی بات نہیں ہے۔ دفتر کے کلرک بھی ہوشیار ہو گئے۔ سارے بینک میں وہ خاموش ہل چل پیدا ہو گئی۔ جو ہمیشہ غیر معمولی آمدوں کا پیش خیمہ ہوا کرتی ہے۔ دربان نے پگڑی سنبھالی۔ چوکیدار نے تلوار نکالی۔ اور اپنی جگہ پر کھڑا ہو گیا۔ پنکھا قلی بھی خوابِ خرگوش سے چونکا۔ اور بنگالی بابو رانی صاحبہ کی پیشوائی کے لیے دفتر سے باہر نکلے۔

سائیں داس نے بے نیازی کی شان تو بنا رکھی تھی۔ مگر دل امید و بیم سے کانپ رہا تھا۔ ایک والئی ملک سے معاملہ کرنے کا یہ پہلا سابقہ تھا۔ گھبراتے تھے کہ بات کرتے بنے یا نہ بنے۔ رئیسوں کا مزاج عرش پر ہوتا ہے۔ معلوم نہیں میری کون سی بات ناگوار گزرے۔ انہیں اس وقت اپنے میں ایک خامی محسوس ہو رہی تھی۔ وہ والیانِ ملک کے آداب مجلس سے واقف نہ تھے۔ ان کی تعظیم کس انداز سے ہونی چاہیے۔ ان سے ہمکلام ہونے میں کس قسم کا لحاظ کرنا چاہیے۔ ان کے حفظِ مراتب کے لیے کس حد تک انکسار مناسب ہے۔ اس قسم کے سوالات انہیں سخت تشویش ہو رہی تھی۔ اور جی چاہتا تھا کہ کسی طرح اس امتحان سے جلد نجات ہو